OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

افسانہ اور پاکستانی تہذیب و معاشرت: حمید شاہد کی افسانوی کائنات کا مطالعہ

Fiction and Pakistani Culture and Society: A Study of Hameed Shahid's Fictional Universe

Nahid Ismail
PhD Scholar, Lahore College for Women University, Lahore
Dr. Shazia Razzaq
Assistant Professor, Lahore College for Women University. Lahore

Abstract

Muhammad Hameed Shahid is an important name in the list of modern fiction writers. He belongs to the generation of fiction writers who adopted the art of fiction writing in the beginning of the eighth half of the last century. He tried to highlight the individual identity of the Pakistani person. He has also highlighted the political and social issues after 9/11 in his fiction based on his observational experience. He is one of the fiction writers who have proved their excellence in both the fields of creation and criticism of fiction. In this article, an analytical study of his fiction writing is presented.

Keywords: Modern fiction, Generation, Fiction writers, Individual identity, Pakistani fiction

تمہید

اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو کا شعری سرمایہ فارسی ادب کا مرہونِ منت ہے تو نثری ادب زیادہ تر فطری ادب کے زیرِ اثر ہے اور نثری اصناف میں بالخصوص افسانہ اپنے دائرہ کار کے لحاظ سے خوبیِ ادب کے اثرات سے معمور ہے۔ یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ افسانہ، شاعری یا ناول کی جگہ نہیں لے سکتا۔ مگر یہ کہنے میں بھی کوئی گریز نہیں کہ شاعری اور ناول بھی افسانے کی جگہ لینے سے معذور ہے۔

افسانہ، ناول کے مقابلے میں انسانی زندگی کے مختصر پیش منظر کا احاطہ کرتا ہے۔ یہی افسانے کے وجود کا بنیادی جواز ہے کہ زندگی

CC BY

کے کچھ حقایق ایسے ہیں جو صرف انسان ہی کی شکل میں منکشف ہوتے ہیں۔ دوسری اصناف میں پیش کش کے لیے مناسب اسلوب اختیار نہیں کر تیں۔

افسانے کو مختصر کہانی کہا جا سکتا ہے۔ کہانی سنانے کا یہ فن اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود انسان، اور کہنے میں کوئی باقی نہیں کہ کہانی کا یہ فن تا قیامت جاری رہے گا۔ قصہ گوئی، داستان سرائی، ناول، کہانی اور اب افسانہ، ممکن ہے کہ مستقبل کا انسان کسی اور نام لیکن بنیادی طور پر یہ فن ہی ہے جو ابتدائی سے کائنات سے عصر حاضر تک پورے تسلسل کے ساتھ جاری رہا۔

حمید شاہد

محمد حمید شاہد کا تعلق بھی اسی فن سے ہے اور جدید افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں تخلیقی جمال اور تحقیقی سوچ واضح نظر آتی ہے۔ ان کے موضوعات بھی نادر ہیں اور اسلوب بھی کمال اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان کے موضوعات اور اسلوب کے پس منظر میں معاشرتی روایات کے رنگ بہت گہرے نظر آتے ہیں اور انھیں اتنے بلیغ طریقے سے استعمال کرتے ہیں کہ قاری باوجود کوشش کے محمد حمید شاہد کے بنے ہوئے افسانوی کینوس سے باہر نہیں نکل سکتا۔

ان کے ہاں موضوعات کا تنوع انھیں دیگر افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔ وہ ان جدت پسندوں سے مختلف ہیں کہ جن کے افسانوی کردار، افسانوی واقعات اور زبان و بیان داخلیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے برعکس محمد حمید شاہد کے افسانوں میں تہذیبی و معاشرتی روایات نے کہانی کو تحلیل ہونے سے بچا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر کا عکس بھی نظر آتا ہے اور ماضی بعید میں پریم چند سے بھی مطابقت رکھتے ہیں۔[1]

محمد حمید شاہد ایک موضوع کو کوئی سطحوں پہ برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔ صرف یہی نہیں اپنے خیالات کی آہٹ کو افسانے کے متن کی بنیاد دینے پر قدرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے "عصری حسیت" کو اپنے تخلیقی عمل کا حصہ بنا کر اسلوب کی سطح پر نئے تجربات کیے ہیں۔ ان کے ہاں تہذیبی و اخلاقی موضوعات کے ساتھ ساتھ سیاسی، گروہی، معاشی، انسانی وجود، نفسیاتی اور نفسی مسائل، زبان اور معنی کے مباحث بھی لمحہ موجود سے جڑے نظر آتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کے بقول:

> "محمد حمید شاہد کے افسانوں کے ہر کردار کو زندگی کے اثبات یا نفی، مسرت یا محرومی کی علامت قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان افسانوں کا ایک ایک کردار ایک ایک لاکھ افسانوں کی نمایندگی کرتا ہے۔ محمد حمید شاہد نے اپنے افسانوں کو لمحہ رواں کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی تاریخ کا درجہ بھی دے دیا ہے"۔[2]

حمید شاہد کے اب تک کئی افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "بند آنکھوں سے پرے" 1994ء میں، دوسرا مجموعہ "جنم جہنم" 1998ء میں، تیسرا مجموعہ "آدمی" 2003ء اور چوتھا مجموعہ "مرگ راز" 2004ء میں شایع ہوا۔ ان کے علاوہ ان کا ایک انتخاب 2015ء میں "دہشت میں محبت" کے عنوان سے منصفہ شہود پر آیا۔ "برف کا گھونسلا" موضوعاتی اعتبار سے دل چسپ افسانہ ہے۔ جس میں حقیقت نگاری کا اسلوب نمایاں ہے۔ بظاہر اس افسانے میں انسانوں اور پر مشتمل دو خاندانوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ جو ایک ہی گھر کے مکین ہیں۔ در حقیقت یہ کہانی طبقاتی فرق کو نمایاں کرتی ہے۔ پرندوں پر کہانی کا مرکزی کردار چھڑیا اور اس کے بچے ہیں۔ چڑیا مے اس گھر میں گھونسلا بنا رکھا ہے۔ اس کا مرکزی کردار چڑیا اور اس کے بچوں کو دانا دنکا ڈالتا ہے۔ جب کہ چڑیا بھی اس کے کسی نہ کسی کام آتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ:

"چڑیا میری محسن بھی تھی، جب سے اس گھر میں آیا تھا میری فجر کی ایک نماز بھی قضا نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے سیر کا ناغہ نہیں کیا تھا"۔[3]

چڑیا اس گھر میں روشن دان کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے داخل ہوتی تھی؛ لیکن سردی کی شدت کی وجہ سے شیشہ دوبارہ لگوا دیا جاتا ہے۔ یوں چڑیا کا گھر میں آنے کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے چڑیا اور اس کے بچے برف میں دب کر مر جاتے ہیں۔ کہانی کے مرکزی کردار پر اس بات کا اتنا اثر ہوتا ہے کہ وہ مری چھوڑنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

کہانی کا یہ انجام قاری پر گہرا اثر کرتا ہے اور مظلوم چڑیا کے دردناک انجام پر افسردہ کر دیتا ہے۔ چڑیا اور اس کے بچے ہمارے سرد معاشرتی رویوں کی عکاس ہیں۔ ایک ماہر کہانی کار کا یہی اعجاز ہوتا ہے کہ قاری کو چیونٹی یا چڑیا کی موت پر رلا دیتا ہے۔ اصغر عابد کے بقول یہ افسانہ اپنے اختتام پر قاری پر سحر طاری کر دیتا ہے۔ اسی افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"مری نے دوشالہ نہیں سفید کفن لپیٹ رکھا ہے اسی کفن میں چڑیا کے پر کھلے ہوئے تھے اور دو ننھے منے بچے اس کے پیروں تلے دبے کب کے اپنی ماں کی طرح زندگی کی سانسیں ہار چکے تھے"۔[4]

برف کا گھونسلا

"برف کا گھونسلا" معصوم کرداروں پر مشتمل خوشیوں سے بھرپور ایک خاندان کی داستان ہے۔ جس میں درد اور الم کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ جسے مصنف نے اپنے خوب صورت اسلوب سے ایسا سجایا کہ اختتام پر جا کر یہ ایک بڑا افسانہ بن جاتا ہے۔

عصرِ حاضر کا ایک اہم مسئلہ "جنریشن گیپ" اس عنوان سے بھی ایک افسانہ محمد حمید شاہد نے تخلیق کیا ہے۔ جوانی اور پرانی نسل کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری پرانی نسل اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنی دھرتی سے جڑی ہے اور نئی نسل جو بظاہر ترقی کرنا چاہتی ہے؛ لیکن اپنی تہذیب سے بہت دور ہے اور اسے کم تر خیال کرتی ہے۔

اس افسانے میں ایک زمیندار گھرانے کی داستان کو پیش کیا ہے۔ جو اپنی ماں دھرتی کو اپنے وجود کا حصہ سمجھتے ہیں اور اپنے پالتو مویشیوں سے بھی اپنی اولاد کی طرح محبت کرنا چاہتے ہیں؛ لیکن اس گھرانے کا اکلوتا وارث ان سب چیزوں سے تعلق توڑ کر ترقی کی راہ پر چلنے کا خواہش مند اور یہ خواہش جو جو بڑھتی ہے اسے زمین اور اس سے جڑی چیزیں حقیر معلوم ہوتی ہیں۔ یاد رہے کہ کسی افسانے کا یہ موضوع نیا نہیں یہ ہماری زندگی کے ہر روز کا مسئلہ ہے؛ لیکن محمد حمید شاہد دل کش زبان اور لفظوں کے بر محل استعمال نے اس افسانے کی قدر قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر حمید شاہد بھی ابھی گاؤں کی زندگی کی عکاسی بھی اسی تہذیبی زندگی کے مطابق کرتے ہیں۔ یہی ان کا کمال ہے۔

"جب پورے پندرہ ور ہے گزر گئے تھے ہماری شادی کو اور میری کوکھ بنجر زمین کی طرح بے آباد تھی۔ جیون کی لذت کا ایسا بھرا ہوا چھنا میں نے پہلے نہ پیا تھا"۔[5]

اور جب نے نئی نسل کے کرداروں کو پیش کیا ہے تو زبان بھی وہی استعمال کی ہے:

"ایک دم باسٹرڈ، ال مینزڈ لیکن میری اس سے ویڈ ہو گئی تھی مگر مجھے بعد میں ایکسپلور ہوا کہ آدمی اپنے سٹرینڈ آرب سے نہ نکلے گا"۔[6]

افسانے میں مصنف کا مقصد یہی ہے کہ ہماری نئی نسل ترقی کے خواب ضرور دیکھے مگر اپنی زمین سے ناطہ نہ توڑے۔

"ماسٹر پیس" محمد حمید شاہد کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں ان کی ذاتی زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ ایسے فن کار کی کہانی ہے جو

افسانہ نگاری چھوڑ کر تنقید کا رخ اختیار کر لیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم ایک ایسے معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں فن اور ہنر کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور صرف دولت ہی عزت اور شہرت کا معیار ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک افسانہ نگار ہوتا ہے جو افسانہ انگاری محض اس لیے چھوڑ دیتا ہے کہ پرانا معیار برقرار رکھنا اس کے لئے ممکن نہیں۔ اسی لیے وہ کہتا ہے کہ:

"خون جگر کب تک جلاتا رہا ہو گا۔ چراغ میں تیل ہو گا تو روشنی ہو گی۔ اس سے قبل کہ تیل ختم ہو جائے مجھے چراغ بجھا دینا چاہیے اور میں نے خون جگر جلانا بند کر دیا اور چراغ بجھا دیا"۔[7]

اس افسانے کا آخری حصہ بھی بہت دل چسپ ہے جو اس افسانے کو دیگر سے ممتاز کر دیتا ہے۔ محمد حمید شاہد کے بہ قول:

"یہ مکمل افسانہ میرے بیوی بچوں کی خوشی ہے اور اس کے اختتامی فقرات میرا سرمایہ مسرت"۔[8]

9/11 کے بعد

محمد حمید شاہد نے عصری سیاسی واقعات کو بھی اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانوں کا موضوع 2000ء میں ہونے والے 9/11 کے حوالے سے واقعات اور اس کے بعد عالمی منظر نامے پر موجودہ سیاسی صورتِ حال ہے۔ اس حوالے سے ان کے افسانوی مجموعے "مرگ زار" میں شامل افسانے، بہ عنوان "ٹوتھ"، "سورگ میں سور" اور "مرگ زارا" وغیرہ شامل ہیں۔ افسانہ "مرگ زار" افغانستان میں جاری سیاسی صورتِ حال، دہشت، وحشت اور بربریت کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ منشایاد کے بقول:

"وہ کہانی جس پر کتاب کا نام رکھا گیا اس کہانی کا موضوع جہاد اور شہادت جیسا نازک مسئلہ ہے۔ جس کی کچھ عرصہ پہلے تک کچھ اور صورت تھی۔ اب نائن الیون اور عالمی طاقتوں کی مداخلت سے کچھ اور صورت بن گئی ہے"۔[9]

اس بارے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کی رائے بھی برمحل ہے:

"مرگ زار رنگ بدلتی دنیا کے اس طرح کی نقش گری ہے جس میں وقت کے جبر میں الفاظ اپنا اعتبار ہی نہیں بل کہ مفہوم بھی کھو بیٹھتے ہیں"۔[10]

"سورگ میں سور" بھی محمد حمید شاہد کے ان افسانوں میں شمار ہوتا ہے جو سیاسی شعور کے حامل ہیں۔ اور اس حوالے سے کام یاب افسانہ ہے۔ اس افسانے میں حمید شاہد نے یہی دیکھا ہے کہ عالمی برادری کس طرح ہماری بنیادی کم زور کر رہی ہے اور اس ملک کو سوروں نے نہیں بل کہ دولت پرست اشرافیہ نے بربادی کے دہانے پر پہنچا دیا ہے۔ نائن الیون سے قبل کی صورتِ حال کو حمید شاہد یوں بیان کرتے ہیں:

"پہلے بے بسی ضرورت تھی لیکن ہمت ہی ٹوٹ جائے، ایسی لاچاری اور بے کسی تھی اور اسی موت کے کھیل سے زندگی کا چچا بر آمد ہو جایا کرتا تھا"۔[11]

اور نائن الیون کے بعد کے منظر نامے کو حمید شاہد یوں بیان کرتے ہیں:

"اور اب یہ ہو چکا ہے کہ کتے بہت زیادہ ہو گئے ہیں بہت زیادہ اور بہت قوی، اتنے زیادہ کہ ہمارے حصے کا رزق بھی کھا جاتے ہیں۔ لہٰذا ہم خوف اور اندیشوں سے کانپے جاتے ہیں"۔[12]

ان مثالوں سے واضح ہے کہ حمید شاہد کا سیاسی شعور بھی پختہ ہے اور تہذیبی شعور بھی۔ ان کے افسانوں میں تفکر، تجسس، تحیر اور

تاثر ایک ہی قالب میں ڈھلے نظر آتے ہیں۔

1970ء کے بعد افسانہ نگاروں نے اس فن کو اعتماد بخشا اور اب ان کی تیسری نسل ہمارے سامنے آچکی ہے۔ بہ قول منشایاد:

''فن پارے کو سہارا دینے، آگے بڑھانے اور زندہ رکھنے کے لئے تیسری نسل سامنے آچکی ہے۔ جس میں انور زاہدی، عبدالوحید رانا، سلیم آغا، شبانہ حبیب، جمیل احمد ندیم، محمد الیاس، یوسف چوہدری اور محمد حمید شاہد جیسے توانا افسانہ نگار شامل ہیں۔ حمید شاہد اپنا علیحدہ اور مضبوط تشخص رکھتے ہیں''۔[13]

ڈاکٹر رشید امجد کی صائب رائے بھی پیش خدمت ہے:''محمد حمید شاہد تواتر سے لکھ رہے ہیں۔ افسانے کے ساتھ ان کی وابستگی پکی ہے۔ ان کی چونکا دینے والی کہانیاں ان کی پہچان ہیں''۔[14]

احمد ندیم قاسمی کے مطابق:''محمد حمید شاہد نے سیمی اور کھری زندگی کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ وہ کہانی کہنے کے فن میں حیرت انگیز طور پر حاوی ہے''۔[15]

محمد حمید شاہد صرف افسانہ نگار ہی نہیں بل کہ نقاد بھی ہیں۔ ان کی افسانوی کائنات تخلیق اور کائنات دونوں کا مرکب ہے۔ افسانہ نگاری میں یہ امتیاز بہت کم فن کاروں کو حاصل ہے۔ افسانہ کی تخلیق کے محرکات کو محمد حمید شاہد یوں بیان کرتے ہیں:

> ''دراصل میں اس بات کا قائل ہوں کی تخلیق کے محرکات خارج سے کہیں زیادہ داخل میں چھپے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ کہ خارج کا کوئی کوئی سانحہ محرک بنا ہے مگر در حقیقت باطن کے اندر یہ خواہش پہلے سے موجود ہوتی ہے کہ باہر کا حادثہ محرک بن جائے۔ گویا کہانی اپنا سرا پھر وہی اندر سے پکڑتی ہے۔ یوں انداز کا سچ ہی کہانی کو ایک نئی معنویت دیتا ہے۔ یہ امر خوش آیند ہے کہ آپ بالکل اتفاق نہ کریں۔ میں چاہتا ہی یہی ہوں کہ آپ اختلاف کریں ٹھیک ٹھاک اختلاف، کیوں کہ میں نے چند کہانیوں کو چھوڑ کر باقی کہانیاں ارادی معنویت کی بجائے نئی معنویت کی اساس پر لکھی ہیں۔ ایسی اساس جو لفظ کا منظوم بھی عطا کرتی ہے اور رد مفہوم بھی، مگر یہ جو اخفائے مفہوم ہوتا ہے میں اس کا قائل نہیں ہوں''۔[16]

بلاشبہ افسانے کی تنقید میں مذکورہ بالا نظریات اہمیت کے حامل ہیں۔ محمد حمید شاہد کے نزدیک افسانے کی تخلیق سے قبل طے شدہ مقاصد کو پس منظر میں رکھ کر کہانی تشکیل نہیں دی جاسکتی۔

انھی کے بہ قول:

> ''کہانی لکھتے ہوئے ارادے سے طے شدہ مفاہیم کو لفظوں کے بطون میں بھی تو نہیں بھرا جاسکتا ہے۔ کم از کم میں جہاں کہیں بالجبر ایسا کرتا ہوں کہ کہانی دہشت زدہ ہو جاتی ہے۔ اس کی آنکھیں الٹنا شروع ہو جاتی ہیں اور ہم دونوں کے بیچ بُعد پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کہانی مکمل ہونے سے انکار کر دیتی ہے''۔[17]

محمد حمید شاہد short story کو مختصر افسانہ کہنے کے حق میں نہیں ہیں۔ انھی کے بہ قول:''ہوا یہ ہے کہ ہمارے ہاں short story کا عین عین ترجمہ مختصر افسانہ قرار پایا ہے اور short fiction کہتے ہوئے یہ تصور باندھ لیا گیا ہے کہ افسانہ تو ناول کا فنی ایجز ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی خرابی کی بنیاد ہے اور اس خرابی سے بچنے کے لیے یہ تسلیم کیا جانا ضروری ہے کہ شارٹ سٹوری کا اردو میں متبادل افسانہ ہے اور یہ ماننا بھی ضروری ہے کہ ہمارے ہاں کا افسانہ قطعاً تعضیری صورت نہیں ہے''۔[18]

خلاصۂ بحث

محمد حمید شاہد کے تحقیقی عمل کے دورانیے میں جو لکھنے والے باطنی متن کو متحرک رکھنے پر قادر نہیں ہوتے ان کے ہاں کسی اسلوب کا بننا لگ بھگ ناممکن ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ متن کو اپنے تجربے کی خواہش سے جوڑنے پر جتے رہتے ہیں۔[19] غرض محمد حمید شاہد کی ادبی شخصیت کی تنقیدی جہت بھی بہت منفرد ہے۔

References

[1] Sayā pāl 'Ānand, *Muhammad Hamīd Shahid kā janum jahannum: An analytical study* (Multān: Salāmat Iqbāl printing press, 2002), 29.

[2] Ahmad Nadīm Qāsmī, *Band Ānkhūn say pary* (Lahore: Al-ḥamd publications,1994).

[3] Qāsmī, Band *Ānkhūn say pary*, 23.

[4] Qāsmī, Band *Ānkhūn say pary*, 28.

[5] Qāsmī, Band *Ānkhūn say pary*, 55.

[6] Qāsmī, Band *Ānkhūn say pary*, 56.

[7] Qāsmī, Band *Ānkhūn say pary*, 103.

[8] Qāsmī, Band *Ānkhūn say pary*, 106.

[9] Manshā yād, "Afsāny kī na'ī sasal kā m'tbar nām. *"Māh nāmah Āfāq*, Dec 2014, 26.

[10] Najībah 'Āraf, *Marg zār kay afsānay* (Karachi: Akādmī baziāft, 2014), 54.

[11] Muhammad Ḥamīd Shāhid, *Marg zār*, 98.

[12] Muhammad Ḥamīd Shāhid, *Marg zār*, 98.

[13] Manshā yād, *Muhammad Ḥamīd shāhid ka Janam jahanum* (Multan: Salāmat Iqbal printing press, 2002), 40.

[14] Dr. Rashīd Amjad, *Tamannā by tāb* (Faisalabad: Al-Islam printing press, 2001), 169.

[15] Aḥmad Nadīm *Qāsmī, Band Ānkhūn say pary* (Lahore: Al- Hamad publications,1994).

[16] Muhammad Ḥamīd Shāhid, *Janam jahannum* (Islamabad: Ast'ārah publications, 1998), 16.

[17] Shāhid, *Janam jahannum*, 7.

[18] Muhammad Ḥamīd Shāhid, *Urdū afsānah bunyādī mabaḥith* (Lahore: Book time publications, 2017), 35

[19] Shāhid, Urdū afsānah bunyādī mabaḥith, 47-48.